رستا ہے لہو ابھی

حافظ یوسف سراج

ہمارے ہاں یہ ریت رہی ہے کہ ہر سانحہ کا ملبہ دوسرے کندھوں پر لاد دیتے ہیں۔ اور بنا دامن اجلا رکھنے کی خاطر تاریخ مسخ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ جو عذر گناہ بدتر از گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ حالانکہ وسعت قلبی سے اگر غلطی تسلیم کرلی جائے تو اس سے شان میں کمی ہرگز واقع نہیں ہوتی۔ زیر نظر مضمون میں اپنی کوتاہیوں اور اغیار کی کج رویوں کا یکساں تذکرہ نہایت درد دل سے کیا نظر آتا ہے۔ کاش یہ وصف پوری تابناکی سے ہماری زندگیوں میں در آئے۔

دسمبر **1971**ء ....کو ڈھاکہ ڈوب گیا!!!!!

مشرقی پاکستان ڈھے گیا!!!!

اور اس بچے کیطرح جسکی ولادت پیٹ چاک کرنے کے نتیجے میں عمل میں آئی ہو... بالکل اسی طرح بنگلہ دیش نے جنم لے لیا۔

مشرقی پاکستان کا گلہ گھونٹ دیا گیا!!!

وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا!! چھن گیا!!

یہ رمنا ریس کورس کا منظر ہے!

وہی رمنا ریس کورس جسے سہروردی گراؤنڈ بھی کہتے ہیں۔ آج (16 دسمبر 1971ء کو) یہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں۔ لگتا ہے سارا شہر امڈ آیا ہے۔ یہ امنڈنے والے بنگالی ہیں۔ آج ان کے چہرے دمک رہے ہیں۔ ابھی ابھی یہ لوگ بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے استقبال سے فارغ ہوئے ہیں۔ فتح کے نشے سے چور جنرل ساتھ اپنی شریمتی کو بھی لایا ہے جونہی یہ جوڑا ہیلی کاپٹر سے نکلا۔ بنگالی مرد اور عورتیں ان پہ ٹوٹ پڑے۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انہیں ہار پہنائے گئے اور ان پہ پھول برسائے گئے۔ ''شریمتی جی'' کے ہاتھوں کو چوما گیا اور اظہار عقیدت کیلئے بوسے دیئے گئے۔

یہ منظر کا ایک حصہ ہے!!

دوسری طرف.........

لیفٹیننٹ جنرل عبداللہ نیازی.....ٹائیگر نیازی اپنی سپاہ کیساتھ موجود ہے۔ بنگالیوں کے چہرے دمک رہے ہیں تو چہرے تو ان کے بھی بے رنگ نہیں ہیں۔

ہاں.........مگر ان چہروں پہ ذلتوں کی دبیز تہہ ہے۔ رسوائیوں کی ان کہی داستانیں ہیں شکستوں کے کبھی نہ دھلنے والے داغ ہیں۔ آہوں اور سسکیوں سے لبریز سینے ہیں۔ گوشہ چشم میں چھپے اشکوں کے قیامت خیز ریلے ہیں۔ کٹے پھٹے کلیجے اور روح سے عاری مردہ جسم ہیں۔

مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوموں کی عزتوں کا سودا دیکھنے۔۔۔ جنرل نیازی نہیں ساری پاکستانی قوم کی تذلیل دیکھنے سے آج ڈھاکہ کا کوئی بھی شہری پیچھے نہیں رہا۔

لیجیئے! جنرل نیازی آگے بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے اروڑہ کو فوجی سلیوٹ کیا۔ ہاتھ ملایا بھارتی سپاہی امڈ آنے والے بنگالیوں کو کنٹرول کر رہے ہیں پیچھے دھکیل رہے ہیں۔

تقریب کیلئے تھوڑی سی جگہ بچی ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی ٹیبل سجادی گئی ہے۔

اب جنرل نیازی کے ہاتھوں میں ایک قلم نظر آرہا ہے شائد وہ دستخط کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ وہ بھلا کس کاغذ پہ دستخط کرنا چاہتے ہیں؟ اس کاغذ پہ جس پر درج ہے۔

''پاکستان ایسٹرن کمان نے مشرقی محاذ پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا منظور کرلیا ہے''

اس سپراندازی کا اطلاق بنگلہ دیش میں موجود پاکستان کی تمام مسلح افواج پر ہوگا جن میں پاکستان کی بری، فضائی، اور بحری افواج، نیم عسکری تنظیمات اور سول آرمڈ فورسز شامل ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے۔

''دستاویز سقوط میں کوئی شبہ پیدا ہونیکی صورت میں جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کا فیصلہ آخری ہوگا''

یہ آخری منظر ہے۔

ڈھاکہ ڈبونے کا، مشرقی پاکستان کھونے کا، بڑا دلدوز منظر ہے۔ غیرتیں کچل دینے والا، خود داری روند ڈالنے والا، غروب غیرت قوم پاکستان کا منظر، فاتح اور مفتوح کا منظر سقوط کی دستاویز (نیازی جسے جنگ بندی کا مسودہ کہتے تھے۔) پر جنرل نیازی نے مہر تصدیق ثبت کردی۔ پوری قوم کے منہ پر کالک مل دی۔ اپنا سروس ریوالور خالی کرکے جنرل اروڑہ کو پیش کردیا جنرل اروڑہ نے پاکستانی سپاہیوں کی ایک گارڈ

ہم نے رمضان میں تمہیں رو رو کر کہا اس قوم کو نور جہاں کی ضرورت نہیں خالد بن ولید کی ضرورت ہے۔ اس قوم کو کنجروں کی نہیں طارق ابن زیاد کی ضرورت ہے۔ گویوں کی ضرورت نہیں، عمرو ابن العاص اور ابوعبیدہ ابن الجراح کی ضرورت ہے۔ اس قوم کو میراثیوں کی نہیں محمد ابن قاسم اور محمود غزنوی کی ضرورت ہے

آف آنر کا معائنہ کیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ اب یہی فاتح ہیں۔ یہی گارڈ اور ''آنر'' کے اب یہی مستحق ہیں۔

یہ منظر.....

پوری قوم نے ٹوٹے دلوں اور بہتے اشکوں ملاحظہ کیا۔ غیرتوں پہ تازیانے برس گئے، ہر طرف ماتم کا سماں بندھ گیا، آہ زاریوں کا تانتا اور سسکیوں کا جال بچھ گیا۔ پوری قوم کیلئے یہ ایک جگر پاش منظر تھا۔ 16 دسمبر کا سورج تنہا نہیں ڈوبا ساتھ ہزاروں دل بھی ڈوب گئے۔ یوں کہ ؎

سورج کے ساتھ ہی ڈوب گیا میرا دل بھی آج
اتنا اداس شام کا منظر کبھی نہ تھا

پاکستان کے نصف حصے میں محب وطن افراد ہچکیوں کی زد میں تھے تو دوسرا نصف حصہ اپنی یوم آزادی کی خوشیوں میں مگن تھا۔ رونے والوں میں ایک احسان بھی شامل تھا کہ اس کا سینہ بھی حب وطن سے اٹا پڑا تھا۔ وہ اپنی مسجد میں کھڑا کہہ رہا تھا۔

''آج ہماری اٹھی ہوئی گردنیں جھک گئی ہیں۔
آج ہمارے تنے ہوئے سینے سکڑ کر رہ گئے ہیں
آج ہماری روحیں مرجھا گئی ہیں
آج ہمارے دل بیٹھ گئے
آج ہمارے اعصاب ٹوٹ گئے
آج ہماری آوازیں بجھ گئی ہیں
آج ہمارے جسم چھلنی ہو گئے
آج ہمارے دل زخمی ہو گئے
اور آج ہمارے جگر پھٹ کر رہ گئے ہیں۔ آج یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس لئے کہ ڈھاکہ کی مسجد بیت المکرم ہمارے پاس نہیں رہی۔ آج ہم اسلئے اپنی آنکھوں کے سامنے جالے محسوس کر رہے ہیں۔ کہ چٹاگانگ کی عیدگاہ ہم سے چھن گئی ہے۔ آج معصوم بچے کٹ رہے ہیں۔ آج بیواؤں کے نالے فضائے ارضی کو چیر رہے ہیں۔ آج کتنے معصوم اور مظلوم لوگوں کے گھر جل رہے ہیں۔

آج صرف مشرقی پاکستان کے مسلمان نہیں کٹے ہندوستان کے ساٹھ کروڑ مسلمان بھی بے آبرو ہو کر رہ گئے ہیں۔

تمہیں کون بتلائے کہ آج فاروق اعظم کی روح کتنی بے چین ہے۔ اسی فاروق کی جس نے آتش پرستوں کے وجود کو مٹا دیا تھا۔ ان ہی آتش پرستوں کا ایک کمانڈر مانک شاہ آج مسلمانوں کی لاشوں پہ قہقہے لگا رہا ہے۔ آج تم نے محمد عربی کی امت سے ان کے سر کی اوڑھنی چھین لی ہے۔ آج مسلمان امت، اسکی آبرو، اسکی حرمت مٹ چکی ہے۔ اس کا وقار لٹ چکا اور اس کی عفت کٹ چکی ہے۔ وہ لوگ غلط سوچتے ہیں جو کہتے ہیں بنگالیوں کا وطن گیا۔ بنگالیوں کا وطن نہیں گیا محمد ﷺ کی الاٹمنٹ پہ چھاپا مارا گیا۔ سرور ہاشمی کے دیس پہ ڈاکہ پڑا ہے۔

چٹاگانگ کی سرزمین! رب ذوالجلال کی قسم تو مجھے اتنی ہی پیاری ہے جتنا لاہور اور سیالکوٹ پیارا ہے مسجد کعبہ سے کہہ رہی ہوگی میری ماں! آج مجھے تیرے رکھوالے اغیار کے حوالے کر کے بھاگ نکلے۔ کعبہ کے رب کی قسم میرا ایک بچہ ہے اگر وہ مرجاتا کٹ جاتا مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا آج ہم کیوں زندہ ہیں کاش آج سے پہلے مر گئے ہوتے۔ ہم نے رمضان میں تمہیں رو رو کر کہا اس قوم کو نور جہاں کی ضرورت نہیں خالد بن ولید کی ضرورت ہے۔ اس قوم کو کنجڑوں کی نہیں طارق ابن زیاد کی ضرورت ہے۔ گویوں کی ضرورت نہیں، عمرو ابن العاص اور ابوعبیدہ ابن الجراح کی ضرورت ہے۔ اس قوم کو میراثیوں کی نہیں محمد ابن قاسم اور محمود غزنوی کی ضرورت ہے۔ (احسان الٰہی ظہیر۔ از جاوید جمال ڈسکوی)

دوسرے پاکستانیوں کی طرح ڈھاکہ سے ہزاروں میل دور بلجیم کی لیوون یونیورسٹی میں زیر تعلیم ایک پاکستانی نوجوان نے بھی جونہی یہ خبر سنی تو کانپ کانپ گیا۔ آنکھوں سے بوئے خوں جاری ہوگئی۔ آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ عجب بے بسی کا سا عالم تھا۔ شدت حزن وملال کے عالم میں بار بار یہی الفاظ نوک زبان پر آرہے تھے

''میں اپنے غم والم کی فریاد اپنے خدا کے حضور کرتا ہوں۔''

مقامی ٹیلی ویژن پر مشرقی محاذ پر پاکستانی افواج کے کمانڈر کو سپر اندازی کے معاہدے پہ دستخط کرتے دیکھا۔ یہ منظر بھی دکھایا گیا کہ کس طرح ہندو بھیڑیے پاکستانی قیدیوں سے ذلت آمیز سلوک کر رہے ہیں۔ اس نوجوان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وفور ہم ان واقعات کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں جن سے ہمارے جسم زخمی اور ہمارے دل کٹ چکے ہیں۔ ہماری آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔ آج بیت المکرم کی جامع

سوال کا دوسرا جواب (کہ کیا بنگالی بے وفا تھے؟ غدار تھے؟) یہ ہے کہ نہیں..... بنگالیوں نے قیام پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دی تھیں ہمارے ساتھ وہ بھی چلے تھے۔ معصوم جانوں کا نذرانہ انہوں نے بھی پیش کیا تھا۔ عصمتیں ان کی بھی تار تار ہوئی تھیں۔ خون دینے والوں میں ان کا بھی شمار ہوا تھا۔

بلکہ.....

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں ہی تو رکھی گئی تھی۔
1940ء میں قرار داد پاکستان ایک بنگالی لیڈر خواجہ ناظم الدین نے ہی تو پیش کی تھی

جذبات سے اس کے حواس مشتعل ہوگئے تھے وہ کئی دن اسی کربناک کیفیت سے دوچار رہا۔

خیالات میں ایک ہیجان اور اضطراب برپا تھا جہاد اور شکست ....ناممکن.....جب تک اس جنگ کی ذلت ہماری فتحمندی میں نہیں بدل جاتی ہماری زندگی بے آبرو ہے اور بے آبرو زندگی ....کوئی زندگی نہیں ہوتی۔موجوں کا دھارا بہہ نکلا ہے۔ آنکھوں میں کرب واذیت کے لمحات میں آدھی یادیں چھلکنے لگی ہیں پھر.....

اس نوجوان کے چہرے پر حزن ویاس کی جگہ عزم نو کی چمک لے لیتی ہے۔ اس کا چہرہ اک نئے حوصلے اور نئے عزم سے تمتما اٹھتا ہے وہ پکار اٹھتا ہے۔

پاکستان کی حفاظت کیلئے میں تنہا لڑوں گا۔اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ ہے۔میرے رب کا ارشاد ہے کہ اس نے تمام تر دفاعی قوت ''حدید'' اور دوسرے معدنیات و کیمیاوات میں رکھ دی ہے، (ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اور اسلامی بم از، زاھد ملک)

یہ نوجوان ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں تھے جنہوں نے اس شکست کے داغ کو اپنے سینے پہ سجایا اور تب ہی ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے طور پر اسے دھوکر دم لے گا۔یعنی

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کسطرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

ایک احسان اور قدیر پہ ہی کیا موقوف اس دن ہر پاکستانی احسان تھا اور قدیر تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ڈھاکہ واقعتاً 16 دسمبر کو ڈوبا تھا؟

تو جان لیجئے کہ ایسا نہیں ہے کوئی کہہ گیا ہے

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ڈھاکہ تو اس دن ہی ڈوب گیا تھا جب جنرل نیازی گورنر ہاؤس میں گورنر اے مالک کے سامنے بچوں کی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم خزاں کی زد میں آئے زرد پتے کی مانند کپکپا رہا تھا تب بنگالی بیرا چائے لئے اندر داخل ہوا تو اسے ڈانٹ کر باہر نکا دیا گیا۔ اس نے باہر آکر کہا ''اندر صاب لوگ رورہے ہیں۔'' اسے ڈانٹ دیا گیا۔

لیکن نہیں.....ڈھاکہ اس سے بھی پہلے اس وقت ڈوب گیا تھا جب مجیب کے گھر پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ اور اس کے جلسے میں ''جوائے بنگلہ'' (بنگلہ دیش زندہ باد) کے نعرے بلند ہوئے تھے۔

بلکہ ڈھاکہ اس سے بھی بہت پہلے اس دن ہی ڈوب چکا تھا جب انتخابات سے قبل مجیب نے کہا تھا ''میرا مقصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل ایف او (L.F.O) کو پرزے پرزے کردوں گا۔اور جنرل یحییٰ نے اس نازک موڑ کو سمجھ کر سنجیدہ حل ڈھونڈھنے کی بجائے آگ بگولہ ہوکر کہا تھا ''اگر اس نے مجھے دھوکہ دیا تو میں اسے سیدھا کردوں گا'' حساس قلب وجگر تو اس دن ہی تھرا کے رہ گئے تھے۔کاش اس کو کوئی بتلا سکتا کہ طاقت اور دھونس کی ہی فتح نہیں ہوتی۔نظریہ اگر غلط ہو تو دلائل سے رفع کیا جاتا ہے۔مگر توپوں اور ٹینکوں سے اس کو مسخر کرنا کسی ہٹلر کے بھی بس کی بات نہیں ہوتی۔مگر فوجی دماغ اس کو کم ہی ہضم کرتے ہیں۔ٹھیک ہے ڈھاکہ 16 دسمبر کو نہیں ڈوبا بلکہ سبوتاژ اور ہزیمتوں کا یہ عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔مگر کیوں؟ کیا بنگالی بے وفا تھے؟ کیا انہوں نے غداری کی تھی؟ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ ہاں! ایسا ہوا تھا! پاک آرمی کیلئے ان کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔انہوں نے کھلے بندوں اور بسا اوقات چھپ کر مکتی باہنی کی مدد کی۔انہوں نے اشتعال انگیزی کا ہر حربہ آزمایا۔فوج کیلئے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کردی مقامی ٹھیکیداروں نے راشن کی سپلائی روک دی۔ جہاں ان کا سامنا پاک آرمی سے ہوتا یہ لوگ گالیاں دیتے ان کا تو یہ کردار تھا مگر آفرین ہے ڈسپلن کے ان پتلوں پر جنہوں نے خشک ڈبوں کا راشن تو کھالیا۔عوامی لیگ کی تربتر گالیاں کھا کر گزارہ کرلیا۔مگر وفا کی لاج رکھ لی اور فوجی ڈسپلن کیخلاف کوئی حرکت نہ کی۔ بنگالیوں کے جذبات کیا تھے؟ ذرا اندازہ کیجئے کہ تجارتی حلقوں کا خیال تھا کہ مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے۔وہ مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔عوامی لیگ کا لٹریچر بنگلہ عوام کی برین واشنگ میں مصروف تھا۔اس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا 60% حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے مگر اس پر صرف 20% خرچ کیا جاتا ہے۔جبکہ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف 40% کماتا ہے اور کل آمدنی کا 75% کھا جاتا ہے۔

تعصب کی آگ نے دل کس قدر سیاہ کردیئے تھے؟ صدیق سالک لکھتے ہیں ''پڑھے لکھے لوگوں میں سے جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ ہوا وہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکہ کی شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔وہ مجھے میری خواہش پر سنٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔ چلتے چلتے آرٹ سیکشن کے سامنے رک گئے۔شیلف سے اعلیٰ طباعت والی خوبصورت کتاب نکالی اور بنگالی لہجے میں نفرت سے کہنے لگے ''ذرا ملاحظہ ہو راولپنڈی سے ہمارا ہیڈ آفس ہمیں کیا بھیج رہا ہے؟ یہ قومی دولت کا سراسر ضیاع نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں بھی اس پائے کی کوئی کتاب شائع کی ہے؟ ان کی برہمی کا باعث مرقع چغتائی تھا۔ جس میں غالب کے منتخب اشعار کی مصورانہ ترجمانی کی گئی تھی۔

> جب ضرورت تھی کہ کوئی سیاسی مدبر اٹھتا اور شکوک وشبہات کی دبیز مکروہ تہہ کو پاٹ دیتا۔ جب کسی ایسے مسیحا کی تلاش تھی جو چاک چاک بدن پہ اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر درد کی شدت کو راحت میں بدل دیتا۔.....تب بقول ملکی پریس سیاسی مدبر ''جنرل صاحب'' کراچی میں ایک کتیا کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔اور ڈھاکہ ائیر پورٹ پر فوجی جوان اتر رہے تھے۔

وہ ایک اور جگہ رکے اور شیلف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ''یہ سارا شیلف تمہارے قائداعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے'' زور لفظ ''تمہارے'' پر تھا جسکی چبھن مجھے محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر چلا آیا۔ (میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا) یعنی

مجروح جس سے دل ہی نہیں روح بھی ہوئی
وہ تیر اتفاق سے اک آشنا کا تھا

معلوم ہوتا ہے پاک آرمی کا سابقہ چند غداروں سے نہ پڑا تھا بلکہ ہماری کوتاہیوں اور کوتاہ عملیوں سے پورا بنگلہ دیش ہی ہمارے پچیس ہزار (ابتدائی طور پر) فوجیوں سے نبرد آزما تھا۔ یہ جنگ ہمیں غیروں کیخلاف ہی نہیں اپنوں سے بھی لڑنا پڑ رہی تھی۔ اور بھولے بھالے بنگلہ عوام بغیر سوچے سمجھے بھارتی عزائم کی تکمیل کر رہے تھے۔ اس وقت جب مجیب پاکستان آرمی کے مدمقابل باقاعدہ فوج تیار کر رہا تھا۔ ٹریننگیں دی جارہی تھیں۔ تو کسی نے کہا ''آپ کیا بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان تیاریوں سے آپ پاکستان کی پیشہ ور فوج کا مقابلہ کرسکیں گے؟ مجیب نے جواب دیا کونسی پیشہ ور فوج؟ وہ جو ڈھاکہ میں کرفیو نافذ نہ کرسکی، ساڑھے سات کروڑ عوام کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے خواہ ہتھیار کچھ بھی ہوں گویا ہماری پچیس ہزار آرمی کو یہ جنگ ساڑے سات کروڑ ''اپنوں'' اور چند ہزار بیگانوں کے خلاف لڑنا پڑ رہی ہے۔

سوال کا دوسرا جواب (کہ کیا بنگالی بے وفا تھے؟ غدار تھے؟) یہ ہے کہ نہیں..... بنگالیوں نے قیام پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دی تھیں ہمارے ساتھ وہ بھی لٹے تھے۔ معصوم جانوں کا نذرانہ انہوں نے بھی پیش کیا تھا۔ عصمتیں ان کی بھی تار تار ہوئی تھیں۔ خون دینے والوں میں ان کا بھی شمار ہوا تھا۔

بلکہ.....

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں ہی تو رکھی گئی تھی۔

1940ء میں قرار داد پاکستان ایک بنگالی لیڈر خواجہ ناظم الدین نے ہی تو پیش کی تھی۔

پھر.....

یکا یک ان بنگالیوں کو کیا ہوا کہ وہ ہمارے شانہ بشانہ چلتے چلتے اچانک مدمقابل آ کھڑے ہوئے وہ سنگینیں ..... وہی خنجر جو دشمن کیلئے تھے ان کا رخ دفعتاً ہماری جانب کیوں پھر گیا؟

کیا مجیب نے ان پہ راتوں رات کوئی سحر پھونک دیا تھا؟ کہیں انہیں یادداشت چھین لینے والی گولیاں تو نہیں کھلا دی گئی تھیں؟ یا ہم نے اپنے اعمال وافعال سے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس تحقیق کیلئے ہمیں ذرا تفصیل کیساتھ اس وقت کے مشرقی پاکستان جانا ہوگا۔ عوام میں گھل مل کے ان کے احساسات پڑھنے ہوں گے۔

ڈھاکہ ..... جو بنگلہ دیش کا ''اسلام آباد'' تھا وہاں ناداری کے ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آتے کہ دل کانپ اٹھتا۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے معمولی تنخواہ کیلئے مارے مارے پھرتے۔ راستوں میں جو عورتیں چلتی پھرتی نظر آتیں ان کے پاس ستر پوشی کیلئے چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جو مرد دکھائی دیتے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ ہوتے۔ ان کی سیاہ جلد میں مندی ہوئی پسلیاں چلتی گاڑی سے بھی صاف گنی جاسکتیں۔ بچوں کی حالت بڑوں سے بھی بدتر بلکہ ابتر تھی۔ انکی ہڈیاں کمزور اور جسم نحیف تھے۔ کمزور ٹانگوں کے اوپر ابھری ہوئی توندیں باہر کو امڈ رہی تھیں۔ بعض بچوں کی کمر کے گرد ایک گندھا سا دھاگہ بندھا ہوتا جس سے ایک گھنٹی لٹکتی دکھائی دیتی۔ بنگلہ دیشی بچوں کا یہ واحد کھلونا تھا۔

بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غرب آدمی سے بھی غریب تر تھا۔ مغربی پاکستان کے ایک افسر جب ڈھاکہ پہنچے تو ان کی بیوی نے دو ملازم عورتیں رکھ لیں جب اس فضول خرچی کا سبب دریافت کیا گیا تو جواب ملا،

''فکر نہ کیجئے ان دونوں کی تنخواہ ہمارے راولپنڈی کے واحد ملازم سے بھی کم ہے''

ہمارے ایک سرکردہ لیڈر مغربی پاکستان پہنچے۔ بنگالیوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا وہ انکی تواضع کیلئے دوڑے پھر رہے تھے۔ مگر موصوف صرف مشروبات نوش کرنے پہ اکتفا کئے جارہے تھے۔ بوقت طعام کڑے تیوروں کو دیکھتے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''سر کھانا تیار ہے کب تناول فرمائیں گے؟ جواب میں انکار..... پھر کھانے کا وقت آیا..... پھر انکار وہ سخت تحیر زدہ تھے ساتھ ساتھ کچھ ڈرے ڈرے بھی کہ جانے کس غلطی کی سزا ہے۔ جانے کس بات پہ ناراض ہیں پھر جھجکتے جھجکتے دریافت کر ہی لیا۔ ''سر کھانا کیوں تناول نہیں فرمارہے'' جواب ملا کہ مغربی پاکستان سے ابھی میری کراکری نہیں پہنچی'' کیا بنگالی انسان نہ تھے؟ کیا ان کے برتن اس قدر غلیظ تھے کہ ان میں کسی مغربی پاکستانی کو کھانے سے پرہیز کرنا چاہیئے تھا اور اگر بفرض محال کسی کے ناقص دماغ کی رو سے ایسا تھا بھی تو اس کا برملا اظہار چہ معنی دارد؟

خدا لگتی کہیے کیا بنگالی بے وفا تھے یا ہم نے انہیں غدار بنایا۔ کیا اتنا غیر انسانی سلوک کرنے کے بعد بھی ہم ان سے توقعات وابستہ کرنے کے حقدار تھے؟ کیا کانٹے بو کر گلوں کی توقع کار عبث نہیں؟ کیا

اب کارگل کے ہیرو کی مرضی ہے وہ چاہے تو تاریخ میں اپنا نام اس فہرست میں لکھوا لے جس میں ٹیپو سلطان، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، کا نام دمک رہا ہے۔ یا اپنا نام اس فہرست میں لکھوائے کہ جہاں آج بھی لعنتوں کی برسات برس رہی ہے۔

ببول کے درخت سے انگور حاصل کرنا کسی دیوانے کا خواب نہیں کیا ان حالات میں کوئی بھی مجیب تحریک حقوق کے نام پہ ان کو اٹھاتا تو وہ بلا تاخیر اٹھ نہ کھڑے ہوتے۔ زرخیز زمین میں مناسب وقت پر ہل چلا کر اور پانی دیکر بیج بو دیا جائے تو کوئی کسان یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہ بیج پھوٹ نہ پڑے، اگ نہ آئے۔ اور یہ سب میسر آنے کے بعد اگر بیج اگ آتا ہے تو اس کو غداری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کو بے وفائی کا الزام دیا جاسکتا ہے؟

یہ ہمارا ہی بے حس رویہ تھا جس کو موقع مناسب جانتے ہوئے بعض شر پسند عناصر نے نفرت کا بیج بو دیا اور ہم نے اس کی بیخ کنی کی طرف توجہ نہ دی۔ بلکہ جلتی ہوئی آگ کو اپنے پہلو سے مزید ہوا دیتے رہے۔ تا آنکہ ہمیں وہ دن دیکھنا پڑا۔ جب مجیب کسی ساحر کی طرح پوری مشرقی بنگلہ قوم کو اپنی مٹھی میں لئے ریڈیو پہ اعلان کر رہا تھا۔

''شاید یہ میرا آخری پیغام ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج سے بنگلہ دیش آزاد ہے۔ میں عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہوں اور جو بھی وسائل رکھتے ہوں غاصب فوج کا اس وقت تک مقابلہ کریں جب تک بنگلہ دیش کی دھرتی سے پاکستان کا آخری سپاہی تک نکل نہیں جاتا۔ جب تک آپ مکمل کامیابی حاصل نہ کرلیں اپنی جنگ جاری رکھیں

(بھارت کی مرتب کردہ دستاویزات بنگلہ دیش ج اول ص 286)

اس وقت جب معاملہ حل طلب تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ بنگالی بھائیوں کے ذہن میں بھر جانے والے زہر کو کھرچ دیا جاتا۔ انہیں حقائق کی اجلی روشنی سے سیراب کیا جاتا۔ اور جہاں جہاں اپنی زیادتیاں تھیں ان کا تدارک کیا جاتا۔ جب ضرورت تھی کہ کوئی سیاسی مدبر اٹھتا اور شکوک وشبہات کی دبیز مکروہ تہہ کو پاٹ دیتا۔ جب کسی ایسے مسیحا کی تلاش تھی جو چاک چاک بدن پہ اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر درد کی شدت کو راحت میں بدل دیتا۔.....تب

بقول ملکی پریس سیاسی مدبر ''جنرل صاحب'' کراچی میں ایک کتیا کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور ڈھاکہ ائیر پورٹ پر فوجی جوان اتر رہے تھے۔ جو تھے تو سویلین لباس میں مگر تصنع اور بناوٹ کبھی چھپا کرتی ہے۔

بنگلہ دیشی ائیر پورٹ کے عملہ نے ان کی مخصوص فوجی کٹنگ اور وضع قطع سے ان کو پہچان لیا اور کام چھوڑ کر گھروں کو چلے گئے بعد ازاں اپنے دفاع میں کیا گیا ہمارا ہر عمل ان کے زخموں پہ نمک کی مانند لگتا رہا۔ ان کی شدت نفرت کو بڑھاتا گیا۔ اور وہ بپھرتے رہے۔ لاوا پکتا رہا۔ طوفان پلتا رہا۔ اس لئے کہ ہم نے بر وقت مناسب اقدام کبھی کئے ہی نہ تھے۔ ہم تو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے رسیا ٹھہرے۔ آگ لگ جانے کے بعد کنواں کھودنا ہمارا طرز عمل ٹھہرا۔

قارئین کرام: یہ ہے تاریخ پاکستان کا وہ المناک پہلو جس کی تمام ضروری تہیں میں آپ کے سامنے وا کر چکا ہوں۔ یہ ہماری غلطیوں کی ایک ناقابل فراموش اور تلخ داستان ہے۔ جس پہ جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جس کو دھراتے ہوئے دل پہ اک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ مگر وائے ناکامی۔ صد افسوس کہ ہمارے سالار...چیف ایگزیکٹو ..... پرویز مشرف اپنے بیرون ملک دورے میں فرماتے ہیں۔ ''ہمیں یہ سب کچھ بھول جانا چاہیئے۔ اس پہ کیا کہا جائے کہ

قافلے کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مجھے تو شک گزرتا ہے کہ یہ کسی فوجی جرنیل کا بیان ہے۔ کیا کوئی صاحب بصیرت عسکری اپنی شکست کو بھول سکتا ہے۔ اپنا زیور اتار کو غیر کے حوالے کر دینا بھی فراموش کیا جاسکتا ہے۔ اپنے ہزاروں دھڑکتے دل غیر کی کال کوٹھڑیوں میں دھکیل دیئے جانے کو بھلایا جاسکتا ہے؟

جنرل صاحب! کیا ہم آپ کے اس فرمان عالی شان کے ورود مسعود سے متعلق دریافت کرنے کی گستاخی کر سکتے ہیں؟ کہیں گذشتہ فوجی ادوار کی طرح آپ بھی کوئی گل کھلانے کے درپے تو نہیں ہیں۔ ایک فوجی سے بڑھ کر شکست کی ذلت اور کسک کو کون محسوس کر سکتا ہے۔ آپ کا ازلی دشمن آج بھی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع کر کے آپ کے زخموں کی نمائش سر بازار کر رہا ہے۔ وہ آپ کو یاد دلا رہا ہے کہ ہم نے تمہارا ایک بازو کاٹا تھا۔ عین نصف النہار تمہارے گھر کو لوٹا تھا۔ تمہارا قلب نوچا تھا۔ کبوتر کیطرح آنکھیں بند نہیں کیجئے۔ بلکہ آنکھیں اور دماغ کھول کر سنیئے کہ سپہ سالار اعظم، امیر المجاہدین محمد مصطفیٰ ﷺ کا تو ارشاد ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاسکتا۔

> ''پاکستان ایسٹرن کمان نے مشرقی محاذ پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا منظور کرلیا ہے'' اس سپر اندازی کا اطلاق بنگلہ دیش میں موجود پاکستان کی تمام مسلح افواج پر ہوگا جن میں پاکستان کی بری، فضائی، اور بحری افواج، نیم عسکری تنظیمات اور سول آرمڈ فورسز شامل ہیں۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ پہلی دفعہ ڈسا جانا یاد رکھا جائے۔ پہلی ہزیمت یاد ہو تو دوسری سے بچا جاسکتا ہے۔ جب تم نے ماضی کو فراموش کر دیا تو ہر بار تو تمہاری پہلی بار ہوئی۔۔۔۔ نہ کوئی تمہاری دوسری بار آئے اور نہ آپ بچ پائیں۔ مشرف صاحب سیاست میں تو آپ اناڑی ٹھہرے مگر میدان کارزار سے متعلق آپ کا یہ بچگانہ بیان؟ کیا آپ کسی بازو کٹے انسان کو اپنا یہ سانحہ بھلا دینے کا مشورہ دے سکتے ہیں کیا آپ کراچی کی اس شہید بہن کا خط بھول جائیں گے جو اس نے ۳۱ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''آپ جب کراچی سے روانہ ہوئے تو میں نے اپنا گھبرو بھائی آپ کیساتھ بھیجا تھا اگر آپ اسے صحیح سالم واپس نہیں لا سکتے تو اس کی لاش بھجوانا نہ بھولئے گا'' مگر یہ بہن پھر کبھی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکی۔

زندہ یا زندہ جاوید۔

دیپ پور میں جو قیامت آپ کے جوانوں پہ ٹوٹی کیا آپ اس کو بھی بھلا دینا چاہتے ہیں؟ شائد کہ تم نے واقعی بھلا دیا ہو تو آؤ ہم سے سن لو کہ ع

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا

ہیڈ کوارٹر (ڈھاکہ) سے چند افراد ایک حساس اطلاع پر دیپ پور پہنچے تو دیکھا کہ بٹالین کا سارا علاقہ مقتل میں بدل چکا تھا۔ گندگی کے اک ڈھیر پر پانچ بچے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ ان کے پیٹ سنگینوں سے چاک کئے گئے تھے۔ ان کی ماؤں کی لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر اوندھی پڑی تھیں۔

صوبیدار ایوب..... ان میں اپنے کنبے کے افراد کو پہچان کر چلا اٹھا اور اس انتہائی صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔

جنرل صاحب! آپ کہ جس نے سقوط کارگل کی وجہ سے نواز شریف کو لاشوں کا تاجر سمجھتے ہوئے اتنا بڑا اقدام کیا اور اب سقوط ڈھاکہ جیسے عظیم قومی المیئے کو بھول جانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جناب محترم اس بدنصیب قوم کو شوگر کوٹڈ گولیاں مت دیجئے۔ میٹھی نیند اس نے بہت سو لیا۔ خدا کیلئے یہ قوم اب کسی جراحت پیشہ کی منتظر ہے جو نشتر کی تیز دھار سے اس کے رستے ناسوروں کو اکھاڑ پھینکے۔ ہم نہیں یہ سب بھول سکتے۔ صاحب کہ ہمارے زخموں سے اب بھی تازہ لہو رس رہا ہے۔

سنیئے! اگر کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہو تو یہ بھولنے کا نہیں بہت کچھ یاد کرنے کا وقت ہے۔

یہ قوم آپ کو یاد دلانا چاہتی ہے کہ آج پھر کوئی دوسرا مجیب انہیں خطوط پر کام کر رہا ہے۔ تاریخ آج پھر اپنے آپ کو دھرا رہی ہے۔ وہی زہر ہلاہل جو پاکستان کو دولخت کرنے کا سبب ٹھہرا تھا۔ آج پھر نئے ڈھاکہ کراچی میں مہاجرین کے اذہان میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ آج کی مکتی باہنی پونم کی شکل میں جنم لے چکی ہے۔ عمل وہی ہے مگر کردار بدل چکے ہیں۔ جان لیجئے کہ ابھی وقت ہے بالکل اسی طرح جیسے یحییٰ صاحب کے پاس تھا۔ اس کہانی کو دھرانے سے باز رہنا گر:

یہ قوم اور کچھ بھولے تو بھولے لیکن غداروں کو نہیں بھول پاتی۔ میر جعفر اور صادق غداروں کیلئے آج بھی استعارے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب کارگل کے ہیرو کی مرضی ہے وہ چاہے تو تاریخ میں اپنا نام اس فہرست میں لکھوا لے جس میں ٹیپو سلطان۔ طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، کا نام دمک رہا ہے۔ یا اپنا نام اس فہرست میں لکھوائے کہ جہاں آج بھی لعنتوں کی برسات برس رہی ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کی حفاظت کی جائے اپنے سابقہ زخم دیکھتے ہوئے ان کی کسک کا علاج کیا جائے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ اس کو ہر نگاہ بد اور مکروہ ہاتھوں سے بچائے رکھے۔

خدا کرے میری ارض پاک پہ اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، کھلا رہے برسوں
یہاں سے خزاں کو بھی گزرنے کی مجال نہ ہو

مگر یاد رکھیئے دعاؤں کی قبولیت بھی تب ہی ہوتی ہے۔ جب دل اور عمل میں بھی یہ خواہش جنم لے وگرنہ حالت اس شاعر کی سی ہو جاتی ہے جس نے کہا کہ

ہوتی نہیں دعا ترکِ عشق کی قبول
دل مانتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یا اس والد کیطرح جس کے بیٹے نے نئی کار خریدی اور باپ سے کہا ابا جان دعا کرنا اللہ مجھے اپنے امان میں رکھے۔ تو باپ نے جواب دیا ٹھیک ہے بیٹا مگر یہ مت بھولنا کہ میری دعاؤں کی قبولیت 60 کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار میں تمہارے کام آئے گی۔ اور اگر رفتار اس سے بڑھا دو تو مری دعاؤں پہ اعتماد مت کرنا۔

بقیہ: بطل حریت

وہ وہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کی داڑھی اور سر کے تمام بال سفید تھے۔ ایک بھی سیاہ نہ تھا۔ بہر حال یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی جو نوک قلم پر آ گئی

مولانا محمد دین مجاہد کے عقد میں نیک بخت خاتون آئی اس کے بطن سے 5 بیٹیاں اور 5 بیٹے پیدا ہوئے۔

بڑے صاحبزادے مولانا عبدالعزیز راشد جماعت اہلحدیث کے بلند پایہ واعظ اور خطیب ہیں انہوں نے تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے سلسلے میں بورے والا اور ضلع وہاڑی کی طرف سے بھرپور حصہ لیا۔ کچھ عرصہ گوجرانوالہ میں مسلم مسجد اہلحدیث نوشہرہ روڈ میں بھی خطیب رہے۔ حافظ محمد گوندلویؒ اس مسجد میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ نماز عصر کے بعد دور دراز سے لوگ آتے اور حافظ صاحب کی مجلس علمی میں بیٹھ کر مختلف مسائل دریافت کرتے۔ یہ مجلس مسجد مسلم میں نماز عصر سے مغرب تک منعقد ہوتی تھی۔ سائل کو حافظ گوندلوی عمدہ انداز سے مسائل سمجھاتے اگر کبھی کسی مسئلے کو تحریر کرنے کی نوبت آتی تو مولانا عبدالعزیز راشد صاحب سے کہتے کہ وہ لکھ دیں۔ اس طرح راشد صاحب کو حافظ صاحب کی معاونت کرنے کی سعادت بھی حاصل ہے جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ راشد صاحب کی مسلکی خدمات لائق تحسین ہیں۔ مجاہد صاحب کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر عبدالحفیظ فاروقی صاحب بھی عالم دین ہیں اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ احسن انداز میں ادا کر رہے ہیں اور ان کے دیگر صاحبزادگان بھی اپنی اپنی جگہ ہمت اور بساط کے مطابق دین کا کام کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ چند واقعات اس نیک سیرت انسان کی زندگی کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ جذبۂ جہاد سے مغمور لوجہ اللہ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ صدر ایوب خاں سے ملنے والی قطعہ اراضی کو جو کہ ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں انہیں دی گئی تھی انہوں نے اس لئے لینے سے انکار کر دیا کہ کہیں خلوص نیت سے کئے گئے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔ ان کے پیش نگاہ یہ تھا:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

کارواں جہاد کا یہ انتھک مجاہد کچھ عرصہ بیمار رہ کر اور زندگی کی 108 بہاریں دیکھ کر 9 اگست 2000ء کی شام ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہو گیا۔ اللہ ان کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے آمین۔